فریڈرک اینگلس

The Part played by Labour in the Transition from Ape to Man

Frederick Engels 1876

بن مانس سے آدمی تک پہنچنے میں محنت کا کردار (۱)

سیاسی معاشیات کے ماہرین اس پر زور دیتے ہیں کہ محنت ہر قسم کی دولت کا سرچشمہ ہے۔ واقعی ہے بھی ایسا ہی۔ فطرت کے بعد محنت کا ہی نمبر آتا ہے کہ فطرت وہ سروسامان مہیا کرتی ہے جسے محنت دولت میں ڈھال لیتی ہے۔ مگر اس کے سوا محنت غیر محدود لحاظ سے اور بہت کچھ ہے۔ تمام انسانی وجود کے لئے محنت ایک بنیادی اور اولین شرط ہے، اس کی بنیادی اہمیت اس درجہ ہے کہ ایک معنی میں ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ محنت نے خود انسان کو تخلیق کیا ہے۔

آج سے لاکھوں سال پہلے جب وہ دور تھا جس کا ہم دوٹوک طریقے سے ابھی تک تعین نہیں کر سکتے، زمین کی تاریخ کا وہ دور جسے طبقات الارض تیسرے جُگ کا (Teritiary) زمانہ کہتے ہیں، غالباً اس کے ختم ہوتے وقت انسان سے ملتے جلتے بن مانسوں کی کوئی ترقی یافتہ نسل کہیں گرم آب وہوا کے علاقوں میں آباد تھی--- غالباً اس لمبے چوڑے براعظم پر آباد رہی ہوگی جو بعد میں بحرِ ھند میں غرقاب ہوگیا۔ ڈارون نے ہمارے اسلاف کا لگ بھگ نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ان کے جسم پر بال ہی بال تھے، ڈاڑھیاں تھیں، اٹھے ہوئے کان تھے اور درختوں پر جھنڈ کے جھنڈ رہا کرتے تھے۔ (دیکھئے نوٹ نمبر۲)

قیاساً ان کے رہن سہن کے ڈھنگ کے سبب اوپر چڑھنے میں ہاتھوں کو پاؤں کے بہ نسبت مختلف عمل کرنا پڑا ہے۔ جب یہ بن مانس ہموار زمینوں پر چلتے تو ہاتھوں کی مدد سے چلنے کی عادت سے رفتہ رفتہ آزاد ہوتے گئے اور انہوں نے کھڑے قد سے چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ **یہی فیصلہ کن مرحلہ تھا بندر سے آدمی تک پہنچنے کا۔**

اب تک جتنی قسموں کے بھی بن مانس ملتے ہیں، وہ سب سیدھے کھڑے ہو سکتے ہیں اور کھڑے قد سے چل پھر سکتے ہیں لیکن صرف اشد ضرورت کے وقت اور وہ بھی بے ڈول طریقے سے۔ ان کی قدرتی چال کچھ کھڑی، کچھ جھکی ہوئی ہوتی ہے اور اس میں ہاتھوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اکثر تو زمین پر بند پنجہ ٹیکتے ہیں اور ٹانگیں اچکا کر، اپنے لمبے بازوؤں کے درمیان جسم جھلاتے ہیں، بالکل ایسے جیسے

لنجے لوگ بیساکھی کے سہارے سرکتے ہیں۔ مختصراً چار ہاتھ پاؤں پر چلنے سے لے کر دو پاؤں پر چلنے کے طریقے تک جتنے مرحلے درمیان میں گُزرے ہیں، ان سب کی کوئی نہ کوئی جھلک انسان نما بندروں میں آج بھی نظر آتی ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کے لئے کھڑے قد کی چال صرف ایک مجبوری کا معاملہ ہے۔

ہمارے ان اسلاف بن مانسوں میں یہ کھڑے قد کی چال پہلے تو ایک قاعدہ بنی اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ضرورت بنتی گئی۔ چنانچہ ہاتھ زیادہ سے زیادہ مختلف قسم کے دوسرے کام کرنے لگے۔ بن مانسوں میں آج بھی ہاتھ اور پاؤں کا جس طرح استعمال ہوتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ تخصیص موجود ہے۔ اوپر چڑھنے میں ہاتھ ایک کام انجام دیتے ہیں اور پاؤں دوسرا کام۔ ہاتھوں سے خاص کر خوراک بٹورنے اور سنبھالنے کا کام اسی طرح لیا جاتا ہے جیسے نچلے درجے کے دودھ پلانے والے جانور (mammals) اگلے پنجوں سے کام لیتے ہیں۔ بہت سے بن مانس ہاتھوں کا استعمال درختوں پر اپنا ٹھکانا بنانے میں یا ٹہنیوں کے درمیان ایسی چھت لگانے میں کرتے ہیں جس میں وہ خود کو موسم کی سختیوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ مثال کے طور پر چمپانزی (بغیر دُم کا بندر) یہی کرتا ہے۔ ہاتھ میں ڈنڈا پکڑ کر وہ دشمن سے اپنا بچاؤ کرتے ہیں اور انہی ہاتھوں سے دشمن پر پھلوں اور پتھروں کے گولے برساتے ہیں۔ جب آدمی انہیں پکڑ کر رکھتا ہے تو وہ آدمی کی نقل میں ہاتھوں سے چھوٹے موٹے کئی کام کرنے لگتے ہیں۔ یہیں سے نظر آتا ہے کہ آدمی سے سب سے زیادہ ملتے جلتے بن مانسوں کے ناپختہ ہاتھوں میں اور ان انسانی ہاتھوں میں کتنا بڑا فاصلہ حائل ہے جو لاکھوں سال کی محنت سے سدھر کر، ترقی کر کے اس درجے کو پہنچے ہیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں ھڈیوں اور عضلات کی تعداد بھی برابر ہے اور ان کے جوڑ بند بھی ایک سے ہیں۔ پھر بھی سب سے پست سطح کا وحشی اپنے ہاتھوں سے سینکڑوں ایسے چھوٹے موٹے کام کر لیتا ہے کہ بن مانس ان کی نقل نہیں کر پاتا۔ کسی بن مانس نے اپنے ہاتھوں سے پتھر کا ایک کھردرا سا چاقو بھی نہیں بنایا۔

شروع شروع میں ہمارے ان اسلاف نے ہزاروں سال میں بندر سے آدمی تک کا فاصلہ طے کرتے وقت جن کاموں کے لئے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں کا استعمال سیکھا ہوگا وہ بڑے سیدھے سادے کام رہے ہوں گے۔ سب سے پست سطح کے ایسے وحشی بھی جن کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تنزل کے سبب جانوروں جیسی حالت کے ساتھ ساتھ وہ جسمانی انحطاط سے بھی دوچار ہیں، وہ بھی ان عبوری دور کی نیم انسانی مخلوق کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ پہلے پہل جب انسانی ہاتھوں نے سخت پتھر کو چاقو میں ڈھالنے کی تدبیر کی ہوگی، اس وقت تک اتنا زمانہ گزر گیا ہوگا جس کے سامنے ہمارے علم میں آیا ہوا تمام تاریخی زمانہ ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایک بار پتھر کا چاقو بنا تو فیصلہ کن قدم اٹھ گیا، **ہاتھ کھُل گئے**، اور چابک دستی تو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی ہی تھی۔ اس طرح جو لوچ اور لچک آتی گئی وہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل بھی ہوتی گئی، بڑھتی بھی چلی گئی۔

اب دیکھئے تو ہاتھ صرف محنت کرنے کا ایک عضو نہیں بلکہ **خود محنت کی ہی پیداوار بھی ہے**۔ محنت نے، نئے نئے کاموں کی سادھن نے، پختہ ہوتے ہوئے عضلوں اور ھڈی بوٹی کے جوڑوں کی، اور بڑی مدت میں جا کر ھڈی کی بھی وراثت نے، اس وراثت میں پائی ہوئی نفاست کے نئے اور زیادہ سے زیادہ پیچیدہ کاموں کے مسلسل استعمال نے مل ملا کر انسانی ھاتھ کو کمال کے اس درجے پر پہنچا دیا جہاں

وہ مصور رفائیل کی تصویریں، بت تراش تھوروالڈسن کے مجسمے اور نغمہ نگار پگانینی کی موسیقی وجود میں لا سکے۔

مگر خود ہاتھ کا وجود تنہا نہیں تھا۔ ہاتھ تو بہت ہی مرکب اور کل جاندار جسم کا محض ایک جزو تھے۔ جس شے سے ہاتھ کو فیض پہنچا اسی سے پورے جسم کو پہنچا جو ہاتھ سے خدمت لیتا تھا۔ اور یہ عمل دو طرح تھا۔

پہلے، ڈارون کے لفظوں میں نشو ونما کی ہم آہنگی کے قانون کے تحت۔ یہ قانون کہتا ہے کہ ایک مرکب جاندار وجود کے الگ الگ اعضا کی جو خاص شکلیں بن جاتی ہیں وہ ہمیشہ دوسرے اعضا کی اپنی خاص شکلوں سے گہرا ربط رکھتی ہیں جن کا بظاہر آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ چناں چہ وہ تمام جانور جن میں خون کے سرخ خلیے بغیر مرکزوں کے (cell nuclei) موجود ہوتے ہیں اور جن میں سرکار یڑھ کی پہلی ھڈی سے جوڑ دو قفلیوں (condyles) کے ذریعے ہوتا ہے، ان سب میں بلا استثنا ایسے غدود پائے جاتے ہیں جن سے بچوں کو دودھ پلایا جا سکے۔ اسی طرح دودھ پلانے والے جانوروں میں اگر سم نہیں، کھر ہوں گے تو ان کے معدے بھی جگالی کے لئے کئی منزلہ ہوں گے۔ بعض شکلوں میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں، ان سے جسم کے دوسرے حصوں کی شکلوں میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں اگر چہ ہم اس رابطے کی وجہ بیان نہیں کر سکتے۔ جو بلیاں سر سے پاؤں تک سفید اور نیلی آنکھ والی ہیں وہ ہمیشہ یا تقریباً بہری ہوتی ہیں۔ انسانی ہاتھوں کا رفتہ رفتہ کمال حاصل کرتے جانا اور اسی نسبت سے پیروں کا کھڑے قد کی چال کے مطابق ڈھلتے جانا اور ان کا باہمی ربط جسم کے دوسرے اعضا پر بھی یقیناً اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ لیکن یہ عمل ابھی تک اتنا تحقیق طلب ہے کہ ہم اس حقیقت کو یوں ہی بیان کر دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔

اس سے بھی کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ ہاتھ کی نشو ونما نے باقی جسم پر براہِ راست ایسا اثر ڈالا جو نظر میں بھی آتا ہے۔ معلوم ہے کہ ہمارے بندر سے مشابہہ پیشرو جھنڈ بنا کر رہنے کے عادی تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کا پتہ لگانا قطعی ممکن نہیں کہ تمام حیوانات میں سب سے زیادہ گھل مل کر رہنے والا حیوان--- یعنی انسان اپنے سے ذرا پہلے کے الگ تھلگ رہنے والے پیشرو سے کہاں، کس مرحلے پر الگ ہوا۔ ہاتھ کی نشو ونما کے ساتھ اور محنت سے آدمی کا قابو فطرت پر بڑھنا شروع ہوا اور اس نے بڑھتے ہوئے ہر ایک قدم پر اس کی نگاہ کو وسعت بخشی، قدرت کی دی ہوئی چیزوں میں وہ برابر نئی، اچھوتی، انجانی خاصیتوں کا پتہ لگاتا گیا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ محنت کی ترقی نے باہمی سہارے اور مل جل کر کام انجام دینے کی بدولت لازمی طور سے سماج کے الگ الگ لوگوں کو جوڑنے میں مدد دی کیوں کہ مل جل کر کام کرنے میں ہر ایک فرد بشر کو فائدے نظر آنے لگے۔ مختصر یہ کہ آدمی اپنی بناوٹ یا اٹھان کے دور میں ہی اس مقام پر پہنچ گیا جہاں **ایک کو دوسرے سے کچھ نہ کچھ کہنے کی ضرورت** پیش آئی۔ اس ضرورت نے خاص عضو بخشا: بن مانس کے بے تربیت حلق میں آہستہ آہستہ زبان کے گھماؤ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے قطعی طور پر تبدیلی ہوئی اور وہ اس قابل ہو گیا کہ زیادہ ترقی یافتہ آوازیں حلق سے نکال سکے اور منھ کے اعضا ایک کے بعد ایک حرف کا تلفظ ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتے گئے۔

جانوروں سے آدمی کا تقابل کیجئے تو ثابت ہو جائے گا کہ محنت کے عمل سے اور اسی عمل کے سلسلے میں زبان کی ابتدا کو سمجھنا درست ہو گا۔ سب سے زیادہ ترقی یافتہ جانوروں کو بھی جو تھوڑا بہت ایک دوسرے پر ظاہر کرنا (یا کہنا) ہوتا ہے، اسے بھی مختلف تلفظ والی آوازوں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اپنی قدرتی حالت میں کسی جانور کو یہ کوتاہی یا بے بسی نہیں معلوم ہوتی کہ وہ آدمی کی بولی نہ ادا کر سکتا ہے، نہ سمجھ سکتا

ہے۔البتہ جب آدمی اسے پال لے تو اور بات ہے۔کتا اور گھوڑا آدمی کے ساتھ رہتے رہتے تلفظ والی آوازوں کے سننے اور سمجھنے کی ایسی عمدہ صفت پیدا کر لیتے ہیں کہ اپنی سوجھ بوجھ کے دائرے میں کوئی بھی زبان آسانی سے سمجھنے لگتے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے ایسے جذبات کی وہ صلاحیت بھی حاصل کر لی ہے--- مثلاً انسان سے محبت اور شکر گزاری وغیرہ، جو کسی زمانے میں ان کے لئے بالکل اجنبی رہے ہوں گے۔جس شخص کو ایسے جانوروں سے کافی واسطہ رہ چکا ہے وہ اس یقین سے بمشکل انکار کر سکتا ہے کہ اکثر موقعوں پر ان جانوروں کو کچھ نہ کچھ کہنے کی بے تابی ہونے لگتی ہے اور اب وہ نہ کہہ سکنے کو ایک بڑا عیب یا معذوری محسوس کرتے ہیں، اگر چہ بدقسمتی سے یہ بے بسی لاعلاج ہے کیوں کہ ان کے صوتی اعضا دوسری سمت میں پہلے ہی پختہ ہو چکے ہیں۔مگر جب حیوانوں میں صوتی اعضا موجود ہیں ان میں خاص حدود کے اندر یہ معذوری بھی دور ہو جاتی ہے۔پرندوں کے دَھنی اعضا کی ساخت آدمی سے انتہائی مختلف ہے۔تاہم پرندے ایسے جانور ہیں جو بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔۔اور پرندوں میں بھی سب سے ہولناک آواز کا پرندہ طوطا ہے، جو بولنے میں سب سے تیز ہے۔اس پر یہ اعتراض اُٹھایا جا سکتا ہے کہ طوطا جو بولتا ہے سمجھتا نہیں۔یہ صحیح ہے کہ محض لذت گفتار کی خاطر اور انسانوں سے قربت کے لطف میں طوطا گھنٹوں ایک سانس بولتا چلا جاتا ہے اور جتنے لفظ اسے معلوم ہوں سب دوہرا ڈالتا ہے۔لیکن اپنی سمجھ بوجھ کے دائرے میں وہ جو کہتا ہے اسے سمجھنا بھی سیکھ لیتا ہے۔کسی طوطے کو گالی کوسنے کے لفظ اس ڈھب سے سکھا کر دیکھئے کہ وہ ان کا مطلب بھی سمجھتا جائے (گرم ملکوں سے واپس آتے ہوئے جہازی اپنی تفریح کے لئے یہ شغل اختیار کر لیتے ہیں) اور پھر ذرا طوطے کو ستا کر دیکھئے، وہ ایسی برمحل کھری کھری ملاحیاں سناڈالے گا جیسے برلن کا کوئی کنجڑا۔یہی بات کھانے کی چھوٹی موٹی چیزوں کے مانگنے پر بھی صادق آتی ہے۔

اول تو محنت اور پھر بعد میں اس کے ساتھ ساتھ قوت ناطقہ (گویائی) یہ دو سب سے اہم محرک تھے جو اپنے اثر سے بن مانس کے دماغ کو رفتہ رفتہ اس انسانی دماغ تک لائے جو اپنی مشابہت کے باوجود بن مانس کے دماغ سے بڑا بھی ہے اور زیادہ مکمل بھی۔دماغ کی نشوونما ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے فوری اوزاروں، یعنی حواسوں کے اعضا کی ترقی بھی ہوئی۔جیسے قوت ناطقہ کی رفتہ رفتہ ترقی سے قوت سماعت کے عضو کا نکھرنا اور سدھرنا تال میل رکھتا ہے، ٹھیک اسی طرح دماغ کی ترقی بھی مجموعی طور پر تمام حواسوں کی ترقی اور نکھار کے ساتھ چلتی ہے۔عقاب کی آنکھ آدمی کی نظر سے کہیں دور پہنچتی ہے لیکن انسانی آنکھ کو چیزوں کی شناخت عقاب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔کتے کو آدمی سے زیادہ سونگھنے کی حس (شامہ) میسر ہے لیکن بو اور بو کا فرق، جو انسان کو مختلف چیزوں کی شناخت دلاتا ہے، کتے کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملا۔اسی طرح چھونے کی قوت (لامسہ) جو بن مانس کو بالکل ابتدائی شکل میں بمشکل کسی قدر حاصل ہوتی ہے، خود انسانی ہاتھ کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اور محنت کی راہ سے بڑھتی گئی ہے۔

محنت اور قوت گفتار پر دماغ کی نشوونما کا، اس سے وابستہ احساسات کی ترقی کا، شعور، کلیے بنانے اور فیصلے کرنے کی قوت کے بڑھتے ہوئے نکھار کا جو اثر ہوا وہ محنت اور گفتار دونوں کو برابر آگے بڑھتے رہنے کی تحریک دیتا رہا۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ جوں ہی آدمی آخر کار بن مانس سے علاحدہ ایک وجود بن کر ابھرا تو یہ ترقی اپنے انجام کو پہنچ گئی بلکہ مجموعی طور پر وہ اور بھی زبردست اگلا قدم اٹھاتی رہی۔البتہ آدمی کے مختلف گروھوں اور مختلف زمانوں میں ترقی کے درجے اور ترقی کی سمت کا فرق بھی باقی رہا۔**ایسا بھی ہوتا رہا کہ کبھی کبھی اور کسی کسی**

جگہ ترقی کے بجائے عارضی تنزل آ گیا۔ تاہم وہ عام طور پر آگے بڑھتا رہا۔ اس کے علاوہ ایک نیا عنصر زندگی میں داخل ہوا جس نے ایک طرف تو اس ترقی کا زبردست تقاضا کیا اور دوسری طرف اسے خاص ڈگر پر آگے بڑھایا، یہ نیا عنصر مکمل انسانی وجود کے ساتھ ابھرا اور اس کا نام تھا سماج۔

درختوں پر کود پھاند مچانے والے بندروں کے جھنڈ سے ہوتے ہوتے انسانی سماج تک پہنچنے میں لازمی طور پر لاکھوں سال لگے ہوں گے جو کرہء ارض کی تاریخ میں اس سے زیادہ وقفے کی اہمیت نہیں رکھتے جتنا آدمی کی مدت حیات میں ایک سیکنڈ * لیکن بہرحال وہ وقت بھی آ ہی گیا، انسانی سماج ابھرا۔ وہ خاص بات کیا ہے جو بندروں کے جھنڈ اور انسانی سماج میں وجہء امتیاز بنتی ہے؟ وہ محنت ہے۔ بندروں کی کھیپ اتنے میں ہی خوش تھی کہ جغرافیائی حالات اور پڑوس کی کھیپ کے مقابلے یا ٹکراؤ سے جتنی کچھ جگہ اسے اپنا پیٹ بھرنے کو میسر آ جائے اسی پر بسر کر لے۔ پیٹ بھرنے کی نئی جگہیں حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ٹھکانے بھی بدلے، مقابلے بھی کئے لیکن یہ بس کی بات نہ تھی کہ قدرتی حالت میں جو کچھ ان ٹھکانوں سے میسر آ جاتا، اس سے کچھ زیادہ نکال لے، سوائے اس کے کہ بے خبری میں وہ زمین کو اپنے فضلے سے اور زرخیز بنا دے۔ جب منھ مارنے کی ساری جگہیں بھر گئیں تو بن مانسوں کی آبادی بھی تھم گئی۔ حد سے حد یہ کہ جتنے جانور موجود ہیں، اتنے ہی رہ جائیں۔ لیکن جانوروں کے وجود سے خوراک بہت ضائع ہوتی ہے، نہ صرف خوراک بلکہ اس کی کونپل بھی پنپنے سے پہلے برباد ہو جاتی ہے۔ شکاری تو چھوڑ بھی دے لیکن بھیڑیا اس ہرنی کو زندہ نہیں چھوڑتا جس کے بچے اگلے سال خوراک بن سکتے۔ یونان میں بھیڑ بکریوں نے چھوٹی جھاڑیاں بھی تناور ہونے سے پہلے کھا لیں اور تمام پہاڑیوں کی ہریالی چٹ کر گئیں جس کے سبب سے پہاڑ بنجر رہ گئے۔ جانوروں کی اس ''غارت گرانہ معیشت'' نے حیوانوں کی نوع میں تبدیلیاں لانے کی بڑی خدمت انجام دی ہے، کیوں کہ اس کی مجبوری سے انہیں اپنی روزمرہ کی خوراک کی عادت میں فرق پیدا کرنا پڑا اور یوں خوراک کی تبدیلی کی بدولت ان کے خون میں اجزائے ترکیبی ادل بدل کر تمام جسمانی ترکیب رفتہ رفتہ دوسرے سانچوں میں ڈھل گئی۔ جانوروں کی جو نوعیں یہ تبدیلی اپنے اندر نہیں لا سکیں وہ ناپید ہو گئیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اسی غارت گرانہ معیشت کی زبردست تاثیر بھی تھی جس نے ہمارے اسلاف کو بن مانس سے انسان کے درجے تک پہنچا دیا۔ بن مانسوں کی وہ نسل جو ذہانت میں اور خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت میں اپنے ہم جنسوں سے سبقت لے گئی ہو گی، اس پر غارت گرانہ معیشت کا اثر یہ ہونا چاہئے کہ جن پھل پودوں سے وہ اپنا پیٹ بھرتی رہی ہو گی اب ان میں اور پھل پودے ملا لئے ہوں گے اور خوراک کے درختوں میں زیادہ سے زیادہ غذائی حصوں کو شریک کر لیا ہو گا۔ نتیجہ یہ کہ خوراک کا میل برابر بدلتا چلا گیا اور اسی کے ساتھ جو غذائی اشیا بدن میں پہنچتی تھیں، وہ بھی بدلتی گئیں۔۔۔ یعنی وہ مادے جز و بدن ہوتے گئے جو بن مانس سے بدلتے بدلتے آدمی میں ڈھل جانے کی کیمیائی ضرورت کی تسکین کرتے تھے۔ یہ سب تو ہوا لیکن ابھی صحیح معنی میں محنت کا عمل دخل شروع نہیں ہوا تھا۔ محنت اوزار بنانے کے ساتھ ظہور میں آتی ہے۔ کون سے ہیں وہ سب سے قدیم اوزار جو آج ہمیں ملتے ہیں؟ ماقبل تاریخی زمانے والے آدمی کی جو قدیم سے قدیم وراثت دستیاب ہوئی ہے، اس کو نظر میں رکھتے ہوئے، اور اولین تاریخی آبادیوں کے رہن سہن اور آج تک کے انتہائی خام وحشیوں کے طور طریق کو دیکھتے ہوئے ہمیں جن قدیم سے قدیم اوزاروں کا پتہ چلتا ہے وہ شکار اور مچھلی پکڑنے کے اوزار ہیں، شکار والے اوزار تو ہتھیار کے کام بھی آتے تھے۔ لیکن شکار اور ماہی گیری سے یہ بھی نکلتا ہے کہ تب تک جو محض سبزی ترکاری کی غذا رہی تھی، اس کے

ساتھ ساتھ گوشت خوری آتی گئی اور یہ تبدیلی ایک اور اہم قدم تھا بن مانس سے آدمی کی طرف سفر کی جانب۔ **گوشت کی خوراک** جسم کو تقریباً تیار حالت میں وہ انتہائی ضروری اجزا مہیا کر دیتی ہے جو جزو بدن ہو جاتے ہیں۔ اس نے نہ صرف ہاضمے کا وقت بلکہ آدمی کے جسم میں نباتاتی زندگی سے مطابقت رکھنے والے اور کئی نباتاتی عمل کا وقت بھی کم کر دیا اور اس ترکیب سے اتنا وقت، سروسامان اور جذبہ شوق حاصل ہوا جس سے حیوانی زندگی زیادہ بھرپور اور زیادہ سرگرم عمل ہو سکے۔ یوں یہ تشکیل پاتا ہوا آدمی نباتات کی دنیا سے جتنا دور نکلتا گیا اتنا ہی وہ حیوانات سے بلند و برتر ہوتا گیا۔ جس طرح جنگلی کتے بلی گوشت کی غذا کے ساتھ سبزی ترکاری کے عادی ہوتے ہی آدمی کی خدمت میں لگ جاتے ہیں، اسی طرح وہ آدمی جو بن مانس سے آگے کی جانب سفر کر رہا تھا سبزی ترکاری کی غذا کے ساتھ گوشت کھانے کی طرف مائل ہوا تو اس کے بدن کو طاقت اور جسم کو آزادی دینے میں اس خوراک سے بہت مدد ملی۔ گوشت کی خوراک کا دماغ پر سب سے گہرا اثر پڑا کہ دماغ کو غذائیت اور اٹھان کے لئے جن اجزا کی شدید ضرورت تھی وہ پہلے سے بھرپور مقدار میں نصیب ہونے لگے اور اب دماغ ایک نسل کے بعد دوسری نسل میں زیادہ تیزی سے اور زیادہ خوبی کے ساتھ بڑھنے پنپنے لگا۔ جو لوگ سبزی خوری کے حامی ہیں، ان کا احترام کرتے ہوئے، یہ بھی کہنا ہے کہ گوشت کی خوراک کے بغیر آدمی وجود میں نہیں آیا ہے۔ اور اگر اس کے کارن وہ سب جاتیاں، جو ہمارے علم میں ہیں کسی نہ کسی وقت میں آدم خوری میں مبتلا رہی ہیں تو آج ہمیں اس بات سے کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہئیے (برلن والوں کے اسلاف، ویلے ٹبی والے اور ویلز تو دسویں صدی تک اپنے والدین کا گوشت کھا لیا کرتے تھے)۔

گوشت کی غذا آئی تو اس کے دم سے دو نئی ترقیاں ہوئیں جن کی زبردست اہمیت ہے: ایک تو آگ سے کام لینا اور دوسرے جانور پالنا آگ کے استعمال نے ہاضمے کے عمل کو اور مختصر کر دیا کیوں کہ جب لقمہ پک کر منھ کے پاس پہنچا تو گویا وہ نیم ہضم شدہ تھا، جانور پالنے کی بدولت گوشت کی غذا اور بھی زیادہ استعمال ہونے لگی کیوں کہ اس نے شکار کے علاوہ خوراک کی سپلائی کی ایک تازہ اور باقاعدہ راہ کھول دی۔ اس کے علاوہ دودھ اور دودھ کی اشیاء کی صورت میں غذا کی ایک ایسی نئی چیز مہیا کر دی جو اپنی غذائی ترکیب میں گوشت سے کچھ کم مفید نہیں تھی۔ تو گویا یہ دونوں ترقیاں بجائے خود انسان کو فطرت کی پابندیوں سے آزاد کرنے میں نیا براہ راست ذریعہ ثابت ہوئیں۔ خواہ انسان اور اس کے سماج کی ترقی میں گوشت خوری کے بالواسطہ اثرات نے کتنی ہی بڑی خدمت انجام دی ہو، تاہم اگر تفصیل سے انہیں بیان کرنے بیٹھیں تو ہم اپنے موضوع سے دور نکل جائیں گے۔

جس طرح انسان نے قابل خوراک ہر ایک شے کو گلے اتارنا سیکھا، ایسے ہی یہ بھی معلوم کر لیا کہ کسی بھی آب و ہوا میں کیسے رہا جائے۔ دنیا میں جہاں بھی رہنے بسنے کی گنجائش دیکھی وہیں پھیل گیا اور وہی ایک ایسا حیوان تھا جو اپنی مرضی سے کہاں ٹھکانا کر سکتا تھا۔ اور باقی حیوان مثلاً پالتو جانور اور کیڑے مکوڑے جو ہر قوم کی آب و ہوا میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں وہ اپنے آپ سے اس قابل نہیں ہوئے بلکہ آدمی کی بدولت ہوئے ہیں۔ ایک سی گرم آب و ہوا کے علاقوں کی طرف ڈھلنا شروع ہوا، جہاں سال میں گرمی اور سردی دونوں کا دور ہوتا تھا تو اس کی ضرورتیں بھی بڑھنے لگیں، اب اسے سردی اور رطوبت سے بچاؤ کی خاطر سر چھپانے اور بدن ڈھانکنے کا سامان کرنا پڑا۔ چناں چہ محنت کے نئے میدان کھلے، عمل کی نئی شکلیں سامنے آئیں جو آگے چل کر آدمی کو باقی حیوانات سے اور بھی جدا کرتی چلی گئیں۔

نہ صرف فرد بلکہ سوسائٹی میں بھی ہاتھوں، قوت گویائی کے اعضا اور دماغ ان تینوں کے مل جل کر کام کرنے سے انسان میں یہ صلاحیت اور سکت پیدا ہوئی کہ زیادہ سے زیادہ الجھے ہوئے کام کر سکے، اور ایک سے ایک بڑے مقصد کو نظر کے سامنے رکھ کر اسے حاصل کر سکے۔ ہر نسل جو آتی گئی، اپنے ذمے پچھلی نسل سے زیادہ مختلف کام لیتی گئی، زیادہ خوبی سے اور زیادہ رنگا رنگی سے اپنا کام کرتی گئی۔ اب تک شکار کرنا اور مویشی پالنا

تھااوراب اس میں زراعت کا جوڑ بھی لگ گیا۔ پھر کتائی، بنائی کا نمبر آیا، دھات کا کام، برتن بنانا اور کشتی کھینا بھی شامل ہو گیا۔ تجارت اور صنعت کی جلو میں آرٹ اور سائنس نے ظہور کیا۔ قبیلے تھے، بڑھ کر قومیں اور ریاستیں بن گئیں۔ قانون اور سیاست کی باری آئی اور انھی کے ساتھ ساتھ انسانی چیزوں کی ذہن انسانی میں خیالی شبیہ نمودار ہوئی، یعنی مذہب۔ ان ساری تخلیقوں کے مقابل، جو یوں معلوم ہوتی تھیں گویا اول ذہن انسانی کی پیداوار ہیں اور پھر انسانی سماج پر چھائی ہوئی ہیں، دست محنت کا تیار کیا ہوا سیدھا سادا سامان کم حیثیت ہوتا چلا گیا اور پس منظر میں اس کے کھسک جانے کی زیادہ تر وجہ یہ ہوئی کہ وہ دماغ، جو محنت کا ڈول ڈالتا تھا، وہ سماج کے اٹھان کے بالکل ابتدائی مرحلے میں ہی (مثلاً شروع کے خاندان میں ہی) اس قابل ہو گیا کہ محنت کا جو نقشہ اس نے تیار کیا ہے وہ اپنے ہاتھ کے بجائے دوسروں کے ہاتھوں پورا کرائے۔ تمدن کی تیز رفتار ترقی کا سہرا ذہن انسانی کے سر باندھ دیا گیا کہ یہ دماغ کی ہی ترقی اور سرگرمی کا حاصل حصول ہے۔ لوگ اس کے عادی ہو گئے کہ اپنے عمل کو ضرورتوں کا نتیجہ بتانے کے بجائے اپنے خیالات کا پھل سمجھا اور سمجھایا کریں (حالاں کہ ضرورت ہی اپنا پرتو دماغ پر ڈالتی اور وہاں تحریک پیدا کرتی ہے)۔ چناں چہ وقت گزرتا گیا اور کائنات کا عینیت پرست (idealist) نکتہ نظر جگہ بناتا گیا جس نے خاص کر کلاسیکی قدیم دنیا کے زوال کے بعد سے انسانی دماغوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس کا اثر دماغوں پر آج تک اتنا چھایا ہوا ہے کہ ڈارون کے مکتب خیال کے سب سے خاص مادیت پسند علمائے فطرت بھی انسان کی ابتدا یا آغاز کے متعلق کوئی دوٹوک خیال پیش کرنے سے کتراتے ہیں کیوں کہ عینیت پرستی کے اثر نے انہیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ ارتقا کے عمل میں اس کارنامے کو تسلیم کر لیں جو محنت نے انجام دیا ہے۔

جیسا کہ مذکور ہوا ہے، جانور بھی آدمی ہی کی طرح اپنے عمل سے فطرت کے ماحول میں تبدیلی لاتے ہیں، اگر چہ اس حد تک تبدیلی نہیں کر پاتے، اور یہ تبدیلیاں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بعد میں خود انہی پر اثر کرتی ہیں اور ان کو بھی بدل دیتی ہیں۔ فطرت میں کوئی واقعہ الگ تھلگ نہیں رہتا۔ ہر شے کا دوسری پر اثر پڑتا ہے اور وہ دوسری ہر شے سے خود بھی متاثر ہوتی ہے۔ عالم فطرت کے ہمارے سائنس دان جو معمولی سے معمولی چیزوں کی تہہ میں نہیں اتر پاتے اس کی بیشتر وجہ یہی ہے کہ وہ عالم فطرت میں اس ہمہ پہلو حرکت اور عمل در عمل کے سلسلے **کو بھول بیٹھتے ہیں۔ ذکر آ چکا ہے کہ یونان میں بکریوں نے جنگل کے پھر سے اگنے کی راہ** بند کر دی؛ سینٹ ھیلینا کے جزیرے میں شروع کے نو واردا اپنے ساتھ جو بکریوں اور سؤروں کے گلے لائے تھے انھوں نے وہاں کی پرانی ہریالی کا تقریباً بالکل ہی صفایا کر دیا اور اس طرح بعد کے جہازیوں اور آبادکاروں کے لائے ہوئے پودوں کے پھیلنے کے لئے زمین بھی ہموار کر دی۔ جانور انجانے میں اپنے اردگرد کی دنیا پر ایک پائدار اثر چھوڑتے ہیں اور خود ان کی ذات تک یہ عمل محض اتفاقی ہوتا ہے۔ آدمی جتنا جتنا جانوروں سے دور ہوتا جاتا ہے، فطرت پر اس کا اثر بے خبری میں یا اتفاقیہ نہیں، بلکہ سوچا سمجھا، باقاعدہ ایسا عمل ہوتا ہے جس سے کچھ طے شدہ مقاصد مراد ہوتے ہیں۔ جانور جب کسی سرزمین کی ہریالی کا صفایا کرے تو اسے خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ آدمی یہی عمل اس نیت سے کرتا ہے کہ زمین صاف ہو تو فصل کو بوائی کی جائے، یا درخت لگائے جائیں یا انگور کی بیلیں چڑھائی جائیں جو اگنے پر اپنے سے کئی گنا زیادہ حاصل دیں گی۔ وہ مفید پودوں اور پالتو جانوروں کو ایک ملک سے دوسرے میں پہنچاتا ہے اور یوں پورے کے پورے براعظم کا نباتیہ و حیاتیہ تبدیل کر دیتا ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مصنوعی نسل کشی کے ذریعے، آدمی کے ہاتھوں پودے اور جانور اس قدر ادل بدل جاتے ہیں کہ ان کی اصلیت کی پہچان نہیں رہتی۔ وہ جنگلی پودے جن سے ہمارے موجودہ اناج نکلے ہیں ایسے غائب ہوئے کہ ان کی تلاش فضول ہے۔ ان جنگلی جانوروں پر بھی اختلاف رائے چلا آتا ہے جن سے کتوں کی مختلف موجودہ نسلیں اور ویسے ہی آج کل کے گھوڑوں کی بے شمار نسلیں نکلی ہیں۔

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ جانوروں میں سوچ سمجھ کر با قاعدہ کاروائی کرنے کی جو صلاحیت ہے اس پر اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ جہاں بھی مادہ حیات (protoplasm) یا زندہ سفید مادہ (albumen) موجود ہے وہیں ابتدائی شکل میں عمل کا با قاعدہ انداز موجود ہوتا ہے، اور یعنی اگر خارج میں کوئی خاص محرک ہے تو خاص قسم کی جوابی حرکت کرتا ہے چاہے وہ کتنی ہی سادہ کیوں نہ ہو۔ یہ جوابی کاروائی ان جسموں تک میں پائی جاتی ہے جن میں اعصابی خلیے کا کیا ذکر، خلیوں کا ہی وجود نہیں ہوتا۔ کیڑے مکوڑے چاٹ جانے والے پیڑ پودے جس طرح اپنے شکار کو پکڑتے ہیں اگر چہ وہ انجانے میں ایسا کرتے ہیں، خود اسی طریقے میں ایک با قاعدہ کاروائی ہوتی ہے۔ جانوروں میں جتنا ان کا اعصابی نظام ترقی یافتہ ہوتا ہے، سوچی سمجھی با قاعدہ کاروائی اسی تناسب سے بڑھتی ہے اور دودھ پلانے والے جانوروں میں وہ اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ انگلینڈ می آدمی شکار پر نکلے تو یہ روزمرہ کا معمولی مشاہدہ ہوتا ہے کہ لومڑی کو اس علاقے کی اونچ نیچ کا جو لاجواب علم ہے وہ اس کا کتنا نپا تلا استعمال کر کے شکاری کو غچہ دے کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے، اسے زمین کا مفید مطلب موقع محل اچھی طرح معلوم ہوتا ہے اور وہ اس سے کام لیتی ہے تا کہ اس کی ملک بھی نہ چھوٹنے پائے۔ ہمارے یہاں پالتو جانوروں میں بھی، جو آدمی کے ساتھ رہنے سے کافی ترقی کر گئے ہیں، شرارت کی ویسی ہی سوچی سمجھی حرکتیں نظر آجائیں گی جیسی بچے کیا کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح ماں کے رحم میں انسانی جنین کے ارتقا کی تاریخ اس لاکھوں برس پر پھیلی ہوئی ارتقائی تاریخ کا ایک خلاصے میں دہرایا جانا ہے، جس میں ہمارے حیوانی اسلاف کیڑے سے ہوتے ہوئے جسمانی ارتقا کے تمام مرحلوں سے گزر چکے ہیں، ٹھیک اسی طرح آدمی کے بچے کا ذہنی نشو ونما انھی اسلاف کی، یا کم از کم ان میں جو بہت بعد کے تھے، ان کی ذہنی نشو ونما کا اور بھی زیادہ خلاصے کی صورت میں دہرایا جانا ہے۔ کچھ بھی ہو، لیکن سبھی قسم کے جانوروں کی با قاعدہ کاروائی زمین پر اپنے ارادے کی چھاپ لگانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ یہ کام صرف آدمی کے بس کا تھا۔

مختصر یہ کہ جانور فطری ماحول کا محض استعمال کرتا ھے اور صرف اپنی موجودگی سے اس میں تبدیلیاں لاتا ہے؛ آدمی اپنی لائی ہوئی تبدیلیوں کے ذریعے فطرت سے اپنے مقاصد پورے کراتا ہے، اس کی تسخیر کرتا ھے۔ آدمی اور دوسرے حیوانوں میں یہی آخری اور مکمل حد فاصل ہے اور پھر دیکھئے تو محنت ہی ہے جو یہ حد فاصل کھینچتی ہے۔ (*مسودے کے حاشیے پر اینگلس نے ایک لفظ لکھا ہے Veredlung یعنی ترقی)

تاہم انسان نے فطرت پر جو فتوحات پائی ہیں، ان کی بنا پر کچھ زیادہ خودستائی نہیں کرنی چاہئے کیوں کہ ایسی ہر ایک فتح پر فطرت ہم سے انتقام لئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ صحیح ہے کہ شروع میں تو ہر ایک فتح سے ہماری توقع کے مطابق نتیجہ نکلتا ہے لیکن دوسری تیسری باری میں بالکل ہی دوسرے قسم کے اور غیر متوقع اثرات ظاہر ہوتے ہیں جو اکثر و بیشتر پہلے نتیجے کو دھوڈالتے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے میسوپوٹامیا، یونان اور ایشیائے کوچک وغیرہ مقامات پر جنگل اس خیال سے صاف کئے تھے کہ زمین پر کاشت کریں گے، انہیں وہم وگمان بھی نہ ہوگا کہ جنگلوں کا صفایا کرتے وقت وہ بادل سمیٹنے اور پانی اکٹھا ہونے کے مرکز بھی غائب کئے دے رہے ہیں اور یوں ان ملکوں میں مفت کی وہ مصیبت مول لے رہے ہیں جس میں آجکل مبتلا ہیں۔ جب الپس کوھستانی سلسلے کے اطالویوں نے جنوبی ڈھلانوں پر دیودار کے وہ جنگل خرچ کر لئے جو شمالی ڈھلانوں پر ایسی بہار دیتے ہیں، تو انہیں کیا خبر تھی کہ جنگلوں کا صفایا کر کے وہ اپنے علاقے کی ڈیری صنعت کی جڑوں پر کلہاڑی چلا رہے ہیں، جنگل تو اڑا دئے لیکن یہ خیال تک نہ آیا کہ اس حرکت سے وہ پہاڑی چشموں کو اس پانی سے محروم کر لیں گے جو سال کے زیادہ دنوں تک میسر آتا اور یہ راستہ بنا دیں گے کہ برسات کے دنوں میں پہاڑی ندی نالے ان پر اور زیادہ طوفانی دھارے چھوڑ دیں۔ یورپ میں آلو کی فصل پھیلانے والوں نے یہ کب سوچا تھا کہ نشاستہ بھرے ان جڑیلے گولوں سے وہ بچوں میں کنٹھ مالا کی بیماری (scrofula) پھیلائے دے رہے ہیں۔ چناں چہ ہر قدم پر ہمیں یاد دہانی کی

جاتی ہے کہ فطرت پر باہر سے ہم اس طرح حکم نہیں چلا سکتے جیسے کوئی فاتح غیر ملکی مفتوح پر من مانی حکمرانی کرتا ہے، ہم فطرت کے باہر نہیں، گوشت پوست، خون اور دماغ کے ساتھ ہم بھی فطرت سے وابستہ اور اسی کے درمیان سانس لیتے ہیں۔ فطرت پر ہمارا جتنا قابو ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اور مخلوق پر ہمیں یہ فضیلت حاصل ہے کہ فطرت کے قاعدے قانون سیکھ سکتے ہیں اور ان کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ روز بروز فطرت کے ان قاعدوں کی سوجھ بوجھ بڑھتی جاتی ہے اور ہم اچھی طرح ذہن نشین کرتے جا رہے ہیں کہ فطرت جس ڈگر پر چلی آ رہی ہے، جب ہم اس میں دخل اندازی کرتے ہیں تو فوراً اس کا اثر کیا پڑتا ہے اور بہت دور جا کر اس کے کیا نتیجے نکلتے ہیں۔ خاص کر ہماری انیسویں صدی میں نیچرل سائنسوں نے جو زبردست ترقیاں کی ہیں، ان کی بدولت اب ہم پہلے سے کہیں زیادہ اس قابل ہیں کہ اور کچھ نہیں تو ہماری روزمرہ کی پیداواری سرگرمیوں کے فطرت پر جو دوراز کار اثرات پڑنے والے ہیں، ان کا پہلے سے اندازہ کر لیں اور اندازہ کر کے قابو پا سکیں۔ لیکن اس سمت میں جتنی ترقی ہوتی جائے گی، اسی قدر آدمی نہ صرف احساس کرے گا بلکہ اچھی طرح جانے گا کہ فطرت میں اور اس میں دوئی نہیں ہے اور اتنا ہی اس بے تکے اور نامعقول خیال کا قائم رہنا ناممکن ہوتا جائے گا جو ذہن انسانی اور مادے کے درمیان، آدمی اور فطرت کے درمیان، روح اور جسم کے درمیان تقابل کا قائل تھا، وہ خیال جو یورپ میں کلاسیکی قدامت کے زوال کے بعد ابھرا تھا اور جس خیال نے مسیحی اعتقاد میں اپنی معراج حاصل کر لی تھی۔

ہزاروں سال لگتے تھے تب کہیں جا کر ہمیں تھوڑی سی آگاہی نصیب ہوتی تھی اس بات کی کہ پیداوار کے عمل میں ہماری سرگرمی سے بہت آگے چل کر کیا **قدرتی** اثرات ہونے والے ہیں، لیکن اس سرگرمی کے دوراز کار **سماجی** اثرات کیا ہوں گے، ان کا پہلے سے اندازہ لگانا اور بھی زیادہ دشوار رہا ہے۔ ابھی اوپر ہم نے آلو کی خوراک اور اس سے کنٹھ مالا کی بیماری پھیلنے کا ذکر کیا۔ مگر اس بیماری کی کیا حیثیت رہتی ہے اگر اس کا مقابلہ کیا جائے اس سے کہ مزدور جب آلو کی خوراک پر اتر آئے تو پورے پورے ملک میں عام آبادی کے رہن سہن پر ایسی خوراک کا کیا اثر پڑا یا اس واقعے سے کہ آلو کی فصل میں پت روگ لگ جانے کے باعث ۱۸۴۸ء میں آئرلینڈ میں قحط پڑ گیا تھا جس سے آلو پر گزر بسر کرنے والی دس لاکھ کے قریب آبادی موت کے منھ میں اتر گئی اور بیس لاکھ آدمی وطن چھوڑ کر نکل گئے! جب عربوں نے شراب کشید کرنا سیکھا تھا تو انہیں کیا معلوم تھا کہ اس دریافت کے ذریعے وہ تب تک نامعلوم امریکی برِاعظم کے خانہ بدوش قبیلوں کو روئے زمین سے ناپید کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار ایجاد کر رہے ہیں۔ بعد میں جب کولمبس نے اس امریکہ کو دریافت کیا تو اسے خبر بھی نہیں تھی کہ امریکہ کی دریافت سے نیگرو غلاموں کے کاروبار کی بنیاد پڑ جائے گی اور غلامی کے چلن کے نام ایک اور عمر کا پٹہ لکھا جائے گا جو یورپ میں تب سے بہت پہلے رخصت کی جا چکی تھی۔ وہ لوگ جو سترھویں اٹھارویں صدی میں بھاپ کا انجن ایجاد کرنے کی دھن میں لگے ہوئے تھے، وہ کہاں جانتے تھے کہ ایسا اوزار تیار کر رہے ہیں جو تمام دنیا میں سماجی رشتوں کو درہم برہم کرنے میں سارے اوزاروں سے بڑھ کر ثابت ہوگا۔ خاص کر یورپ میں تاریخ نے اس جدید اوزار کو یہ مامور کیا کہ تھوڑی سی تعداد کے ہاتھ میں دولت سمیٹ کر، بھاری اکثریت کو اس سے محروم کر کے اول تو بورژوازی کو سماجی اور سیاسی اقتدار بخش دے اور آگے چل کر اسی بورژوازی اور پرولتاریہ محنت کشوں کے درمیان طبقاتی کش مکش بڑھائے جو صرف اسی انجام کو پہنچ سکتی ہے کہ بورژوازی کے اقتدار کا تختہ الٹ جائے اور ہر قسم کی طبقاتی تناتنی کا صفایا ہو جائے۔ لیکن عالم فطرت کی طرح اس میدان میں بھی اب طول طویل اور اکثر بے درد تجربوں کے بعد، تاریخی مسالہ جمع کرنے اور اس کی چھان بین کرنے کے بعد ہم یہ سیکھنے لگے ہیں کہ پیداواری سرگرمی کے جو بالواسطہ اور دوراز کار سماجی اثرات کبھی آئندہ پڑنے والے ہیں ان کو پہلے سے نظر میں تول لیں اور اس طرح اب ہمیں یہ موقع میسر آنے لگا ہے کہ ان اثرات کو اپنے قابو میں بھی رکھیں اور انہیں ایک

قاعدے سے چلائیں بھی۔

مگر اس قاعدے سے چلانے کے لئے صرف علم و آگاہی کافی نہیں، اس کے سوا کچھ اور بھی چاہیئے۔ اب تک جو ہمارا طریق پیداوار چلتا رہا، اس میں اور اسی کے ساتھ تمام موجودہ سماجی نظام میں پوری طرح انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔

اب تک جتنے پیداواری طریقے چلتے رہے ہیں ان کا منشا محض اسی قدر تھا کہ محنت سے جو فوراً اور براہ راست کارآمد حاصل ملتا ہے وہ لے لیا جائے۔ اس کے دوسرے نتیجے سے جو صرف بعد میں ظاہر ہوتے ہیں اور بتدریج بار بار دھرانے اور جمع ہونے سے کارگر ہوتے ہیں ان پر کسی کی نظر نہ گئی۔ جب زمین کی ابتدائی مشترکہ ملکیت کا دور تھا تو ایک طرف اس کا جوڑ بیٹھتا تھا انسانوں کی نشوونما کی ایک ایسی سطح سے جس میں رہ کر ان کی نظر عموماً محدود تھی، اور وہ صرف وہیں تک دیکھ پاتے تھے جو سر دست میسر ہو، اور دوسری طرف اسی میں دستیاب زمین کی کسی قدر افراط کا نکتہ بھی پوشیدہ تھا کہ معیشت کی اس پست سطح کے جو برے اثرات پڑتے، ان کی تھوڑی بہت تلافی اس دستیاب بافراط زمین سے ہو جایا کرتی تھی۔ جب یہ فالتو زمین فالتو نہ رہ گئی تو مشترکہ ملکیت پر بھی زوال آ گیا۔ پیداوار کی جتنی ترقی یافتہ شکلیں آئیں وہ آبادی کو مختلف طبقوں میں بانٹتی چلی گئیں اور انھوں نے حاکم و محکوم طبقوں کے درمیان مستقل تضاد کی نوبت پہنچادی۔ اس طرح سے حاکم طبقے کا اپنا مفاد ہی پیداوار کی ترقی کی اصلی کنجی رہ گئی اور پیداوار محکوموں کی گزر بسر کے انتہائی ضروری سامان تک محدود نہیں رہی۔ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار پر جو آج کل کے مغربی یورپ میں جاری و ساری ہے، اس طریقے نے پوری مہر ہی لگا دی۔ مال کی پیداوار اور تبادلہ جن کے قبضہ قدرت میں ہے وہی فرداً فرداً سرمایہ دار اپنی کاروائی کے صرف اسی نتیجے سے سروکار رکھتے ہیں جو ہاتھ کے ہاتھ ان کی غرض پوری کرتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اگرچہ جو مال بھی تیار کیا جائے یا جس کا تبادلہ کیا جائے، وہ بہرحال کسی نہ کسی ضرورت میں کام آتا ہے، تاہم یہ مفید نتیجہ نظروں سے اوجھل ہو کر رہ جاتا ہے اور اصل تحریک صرف اس منافع سے ہی ملتی ہے جو مال کے فروخت کرنے سے ہاتھ آئے۔

کلاسیکی سیاسی معاشیات، جو بورژوازی کی سماجی سائنس ہے، انسانی کاروائی کے صرف ان براہ راست مطلوبہ سماجی اثرات کی جانچ کرتی ہے جن کا تعلق پیداوار اور تبادلے سے ہے۔ یہ بات سماج کی اس بناوٹ کے عین مطابق ہے جس سماج کا نظریاتی روپ خود سیاسی معاشیات میں موجود ہے۔ فرداً فرداً سرمایہ دار پیداوار اور تبادلے میں اس غرض سے لگے رہتے ہیں کہ ہاتھ کے ہاتھ منافع ملے۔ اس لئے وہ صرف اس پر نظر رکھتے ہیں کہ انسانی کاروائی سے فوراً کیا حاصل ہونے والا ہے۔ جب تک کوئی کارخانہ دار یا بیوپاری اپنا تیار کیا ہوا یا خریدا ہوا مال خاصے منافع پر اٹھا لیتا ہے وہ اس سے مطمئن رہتا ہے اور اس سے سروکار نہیں رکھتا کہ بعد میں مال پر اور اس کے خریدار پر کیا گزرتی ہے۔ عین یہی بات اسی قسم کے عمل کے قدرتی اثرات پر صادق آتی ہے۔ کیوبا میں اسپینی کھیت لگانے والوں کو کیا پرواہ تھی کہ انہوں نے پہاڑی ڈھلانوں پر جنگل کے جنگل پھونک ڈالے اور ان کی راکھ سے اچھی خاصی کھاد لے لی جو کافی کے باغات کی بہت ہی منافع بخش **صرف ایک** فصل کے لئے کافی تھی۔ انہوں نے ذرا فکر نہ کی کہ گرم ملکوں کی دھواں دھار بارش بعد میں پہاڑی زمین کی اوپر کی اکھڑی ہوئی پپڑی بہالے جائے گی اور صرف ننگی چٹانیں چھوڑ جائے گی۔ فطرت سے واسطہ ہو یا سماج سے، دونوں حالتوں میں آج کل کے طریق پیداوار کو زیادہ تر ان نتیجوں سے غرض رہتی ہے جو ہاتھ کے ہاتھ نکل آئیں اور جن سے وقتی طور پر خوب کام چل جائے۔ پھر اس پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اس نیت سے جو کاروائی کی گئی تھی اس کے بہت آگے جا کر دور از کار

اثرات نہ صرف یہ کہ کچھ اور ہی بلکہ جو سوچا تھا اس کے بالکل الٹ نکلے؛ اور یہ کہ سپلائی اور مانگ میں جو ہم آھنگی ہے اور ہ بعد میں بالکل برعکس سمتوں میں بدل جاری ہے، جیسا کہ ہر دس سال کی مدت میں صنعتی چکر سے ثابت ہوتا ہے اور تو اور، خود جرمنی نے بھی پچھلے صنعتی سنکٹ (۳) میں اس کا مزا چکھ لیا؛ اور یہ کہ نجی ملکیت جس کی بنیاد ذاتی محنت تھی وہ لازمی طور پر ارتقائی راستے سے گزر کر مزدوروں کی عدم ملکیت میں بدل جاتی ہے اور ساری دولت سمٹتے سمٹتے غیر محنت کش لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتی ہے؛ اور یہ کہ...(* یہاں تک آکر مسودے کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہے۔ ایڈیٹر)

۱۸۷۶ء میں لکھا ہوا۔

نوٹس

۱۔ یہ مضمون شروع میں اس خیال سے لکھا گیا تھا کہ ایک مفصل اور بڑی تصنیف پر تعارف کا کام دے گا۔ تصنیف زیر قلم کا عنوان تھا ''غلامی میں رکھنے کی تین بنیادی شکلیں''۔ لیکن جب اس خیال کے عملی جامہ پہننے کی نوبت نہ آئی تو آخر مجبوراً اینگلس نے اس تعارف یا دیباچے کا عنوان یوں کر دیا ''بن مانس سے آدمی تک پہنچنے میں محنت کا کردار''۔ اس مضمون میں اینگلس نے بتایا ہے کہ انسان کی جسمانی ساخت کو اور انسانی سماج کو ایک خاص طرز پر ڈھالنے میں محنت نے، اوزاروں کی ایجاد نے کیا فیصلہ کن رول انجام دیا ہے۔ اینگلس یہاں یہ دکھاتا ہے کہ مدتوں تک کا تاریخی عمل اس نسل کو جو بن مانسوں سے مشابہ تھی، کیوں کر اس سے بالکل مختلف ھستی----- یعنی انسان کو وجود میں لے آیا۔

۲۔ ملاحظہ ہو چارلس ڈارون کی کتاب The Descent of Man and Selection in Relation to Sex آدمی کا توارث اور صنفی انتخاب جو لندن میں ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

۳۔ یہاں مراد ہے ۱۸۷۳ء کے عالمی معاشی بحران سے۔ جرمنی میں اس کی ابتدا مئی ۱۸۷۳ میں ایک ہولناک سنکٹ سے ہوئی اور بحران کا اثر ۱۸۸۰ کے قریب تک چلتا رہا۔

ترجمہ: ظ انصاری

صبغت وائیں نے ٹائپ کیا